eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210

ڈاکٹر رضوانہ نقوی
لیکچرار اردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج فار وومن، جہلم

Dr Rizwana Naqvi
Lecturer, Govt Associate College For Women, Jalalpur Sharif, Jhelum

شہر لاہور کا گمشدہ تابندہ ستارہ: مسعود سعد سلمان

MASOOD SAAD SALMAN: A RADIANT MISSING STAR OF LAHORE CITY

DOI: https://doi.org/10.56276/tasdiq.v4i02.123

ABSTRACT

Masood Saad Salman was a great but unfortunate poet of Lahore. He saw the ruling period of six Ghaznvi sovereigns but passed almost 20 years of his life in prison faultlessly. Masood was a genius of his era who suffered a lot of adversities but didn't give up, rather than these calamities embellished his art. His ancestors were related to Afghanistan & Middle East but he was born in the lap of Punjab's heart the 'Lahore' so feels like an amorous & loving son of this soil in his poetry. He was the choicest poet of encomium (Qaseeda) yet he has practiced in all pieces of poetry but his afflicted odes which are called 'Jassiyat' are masterworks. His encomium and 'Jassiyat' are not only a masterpiece of poetry but also become authentic sources of history by their chronology, another special aspect of these 'Jassiyat' is the love for r homeland where the poet pulsator like Blackbird in the detachment of his homeland Lahore. His poetry has such artistic qualities that it has bewitched not only the east but western poets & critics are also admirers of him especially Brown and Eliot who have translated his poetry and written books on his great art. In Urdu literature he has considered the foremost poet of the Urdu language on the account of Mohammad Oofi and Ameer Khusro however his Urdu Deewan is not available. This article throws light upon the life and art of Masood Saad Salman.

KEYWORDS

Lahore, Masood Saad Salman, Ghaznavi, 11th Century, Qaseeda, Poetry, Poet, Ameer Khusro, Chronology, History

Received: 13-Dec-22
Accepted: 28-Dec-22
Online: 30-Dec-22

مسعود سعد سلمان گیارہویں صدی عیسوی کے وہ نامور شاعر تھے کہ جن کی فنی عظمت نے مشرق ہی نہیں مغرب کو بھی اپنے فن کا اسیر رکھا۔ مسعود جنہیں پنجاب کے دل "لاہور" کا بیٹا ہونے پہ فخر ہے اپنے فن سے نا صرف اہلِ فارس کو ٹکر دیتے ہیں بلکہ مغربی شعر و فن کی کسوٹی پہ بائرن کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ انہوں نے قصائد، غزلیات، رباعیات، اور مثنویوں میں یادگار سرمایہ چھوڑا ہے مگر ان

کے "جسیات" فارسی ادب میں ایک نئے طرزِ احساس کے نمائندہ ہیں کہ جہاں جذبے اور فن کی شدت قاری کی روح و قلب میں اک ایسی کیفیت کو بیدار کرتی ہے کہ جس سے احساس تھر تھرا اٹھتے ہیں۔ فارسی ہی نہیں عربی و ہندوی شاعری کے حوالے سے بھی مسعود کا نام تذکرہ نگاروں کے ہاں گردش میں رہا ہے۔ بالخصوص اردو زبان میں اولیت کا تاج انکے سر رکھا جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ان کا ہندوی دیوان ناپید ہے مگر ڈاکٹر اسپرنگر اور حافظ محمود شیرانی شواہد کی بنا پر انہیں اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق:

"خواجہ مسعود سعد سلمان جن کے متعلق متقدمین اور متاخرین متفقاً کہتے ہیں کہ وہ ہندوی میں بھی صاحب دیوان تھے مجھ کو ان کی ہندی شعر گوئی کے متعلق شبہ تھا کیونکہ جہاں وہ اپنی عربی و فارسی زبان دانی پر اپنے قصائد میں فخر کرتے ہیں وہ ہندوی کا ذکر نہیں کرتے "(1)

مثلا:

کس را بپارسی و تازی امتحاں زد مے
میرا مبارزِ میداں امتحاں شد مے

جبکہ دوسری جگہ کہتے ہیں:

مرا بداں توکہ در پارسی و در تازی
بنظم و نثر ندارد چوں کس استقلال

جبکہ تیسرے موقعے پر کہتے ہیں:

بریں ہر دو زبان درہر دو میداں
بگردونم رسیدہ کامرانی
سجود آرد بہ پیش خاطر من
رواں رود کی و ام ہانی (2)

لیکن ان کا شبہ محمد عوفی کی "لباب الالباب" کے حوالے سے رفع ہو جاتا ہے کہ جس میں مسعود سعد سلمان کے عربی و فارسی دیوان کے علاوہ ہندوی دیوان کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ عوفی کے مطابق:

"داوراسہ دیوان ست یکے بتازی، یکے بپارسی و یکے بہندوی"(3)

عوفی کے ساتھ ساتھ ہندوی دیوان سے متعلق سند خواجہ امیر خسرو کے فرمان سے بھی حاصل ہوتی ہے جن کے نزدیک:

"پیش ازیں شاہان سخن کسے راسہ
دیوان بنود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامم

مسعود سعد سلمان رااگر چہ ہست اماآں
سہ دیوان در عبارت عربی و فارسی و ہندوی
است۔درپارسی مجرد کسے سخن راسہ قسم
نکردہ خرمن کہ درایں کار قسام و عادلم "(4)

چنانچہ ان دو مستند شہادتوں کی روشنی میں نا صرف حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر اسپر نگر بلکہ اردو کے متعدد محققین اس بات کو مانتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان نے ہندوی میں بھی اشعار کہے۔ چنانچہ شیرانی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ

"ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ خواجہ ہندوی میں بھی شعر کہتے تھے۔ مگر بد قسمتی سے انکا ہندوی کلام دستبر دزمانہ کے ہاتھوں شاید ہمیشہ کے لئے برباد ہو گیا۔(5)

مسعود کے والد خواجہ سعد سلمان شہزادہءِ مجد دکے خزانچی کے طور پر بعہد سلطان مسعود شہید ہندوستان وارد ہوئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مسعود سعد سلمان نے اپنی حیات میں چھ غزنوی شاہوں کا عہد دیکھا اور تقریبا60 سال تک ہندوستان میں رہے۔ قیام ہند کا سب سے اہم نقطہ شہر لاہور ہے۔ عظمتوں اور بادشاہوں کا مرکز لاہور کہ جہاں وہ آسمان ادب کا ستارہ بن کر بھی چمکے اور اس کے فراق میں بے حال بھی رہے۔ ہر قدیم شاعر کی طرح مسعود کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش میں اختلافات موجود ہیں۔ یہ اختلافات ان فارسی تذکروں کے حوالے سے ہیں کہ جن میں مسعود کا ذکر تو موجود ہے مگر انکی تاریخ پیدائش سے صرف نظر کیا گیا ہے (محمد عوفی، دولت شاہ، سمرقندی، امین احمد رازی، ہدایت) جبکہ بعض اس حوالے سے ابہام کا شکار ہیں جبکہ محمد قزوینی نے "مسعود سعد سلمان" میں مسعود کا سال پیدائش 48-1046ء بیان کیا ہے۔ دیگر تذکرہ نویس بھی اسی بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ لیکن اقبال حسین خان اپنی کتاب Early Persian Poets of India میں مسعود کا سال پیدائش 1052ء/436ھ بیان کرتے ہیں(6)۔ داغستانی "ہدایت چہار مقالہ اور غلام علی خان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان 515ھ /22-1121ء میں فوت ہوئے۔ جبکہ تقی کاشی کے خیال میں مسعود کا سال وفات 525ھ / 1131ء ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین ان کے ہم نوا ہیں لیکن جدید تحقیق کے مطابق داغستانی کی بیان کردہ تاریخ درست شمار ہوتی ہے۔ اور اس بات کی تصدیق خود مسعود کے قصائد سے بھی ہوتی ہے جن کے مطابق ان کی پیدائش 40-438ھ اور 48-1046ء بنتی ہے۔ چنانچہ اب اسی تاریخ کو درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ تاریخ پیدائش کے بعد جائے پیدائش متعدد تذکروں کے حوالے سے ایک معمہ رہی ہے مگر درست جا کی تصدیق بھی خود مسعود کا کلام کرتا ہے۔ کچھ تذکروں میں مسعود کی جائے پیدائش ہمدان، کچھ میں غزنی اور کچھ میں جرجان ہے۔ اس تمام مغالطے کی وجہ ان کا خاندانی پسِ منظر ہے کہ ان کے اجداد مشرقِ وسطی سے متعلق تھے اور ان تمام علاقوں سے ان کا تعلق اپنے اجداد کے حوالے سے تھا مگر خود مسعود کا مولود ہندوستان کا دل "شہر لاہور" ہے۔ حافظ شیرانی بھی اسی بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ جس کا بیّن ثبوت ان کے اشعار ہیں:

مولدم لاہور و از لاہور دور
ویمک ای لاہوربے تو کسی سرور
چو یاد شہر لہاور و یار خوش کنم
بیاد کسی کہ شدا ز شہر و یار خویش نفور (7)

مسعود کی حیات کے حوالے سے ان کے قصائد و اشعار ایک طرح سے آئینہ ہے کہ جن میں ان کی ذات اور ان کے وابستگان کے عکس نہایت واضح انداز میں اپنی داستان سناتے ہیں۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مسعود کے والد سعد سلمان غزنی بادشاہوں کے ہم رکاب لاہور میں وارد ہوئے۔ یہ پورا خاندان علم و فضل میں معتبر اور لوگوں کی نظروں میں بلند مقام کا حامل تھا۔ گو کہ وہ صاحب ثروت و جاگیر دار نہ تھے مگر علم کی دولت نے اس خاندان کو مالامال کر رکھا تھا۔ اور علم کے اس خزانے پر مسعود کو بڑا ناز تھا۔ ملاحظہ کیجئے

اگر رئیس نیم یا عمید زادہ نسیم
ستودہ نسبت و اصلم زدودہ ءِفضلاست(8)

علم کی دولت تو ان کے پاس تھی ہی مگر غزنی سلاطین نے مسعود کے خاندان بالخصوص ان کے والد کی خدمات کے عوض انہیں لاہور میں ایک بڑی جاگیر عنایت کی۔ شہر لاہور میں مسعود نے اپنی زندگی کے بہاریں دن گزارے شادی کی اور دو بیٹے پیدا ہوئے ایک صالح جو نہایت حسین و جمیل تھا وہ جلد ہی اس جہانِ فانی سے منہ موڑ گیا اور دوسرا بیٹا سعادت اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتا ہوا اپنے نام کی طرح نا صرف سعادت مند ہوا بلکہ شعرا میں عالی مقام بھی ٹھہرا سعادت بہرام شاہ کے دربار سے وابستہ تھا بہرام شاہ کی تعریف میں کہی گئی ایک رباعی کی عوض بادشاہ نے انعام کے طور پر اسکا منہ سونے سے بھر دیا تھا۔ رباعی ملاحظہ ہو:

ہمزاد رُخ نگار مُبو ست نہ گل
زین روی رِخ نگار نیکوست نہ گل
مار ارُخ دوست بایدای دوست نہ گل
زیرا گل چشم مارخ اوست نہ گل(9)

قلعہ مرنج کی قید کے دوران مسعود نے جو قصیدہ لکھا اس میں اس نے اپنے دوسرے بیٹے کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہے۔

مسعود کہ بود سعد سلمان پدرش
جائیست کہ از چرخ گذشتہ است سرش
آن باد چہ گوئی کہ سعادت پسرش
وارد خبرش کہ گوید او را خبرش (10)

مسعود سعد سلمان نے اپنے والد کے سایہ الفت میں علم و ادب میں نام کمایا اور سماج میں معزز ٹھہرے نا صرف بطورِ شاعر بلکہ ایک بلند ہمت، عالی اوصاف اور دانش مند انسان کے طور پر ان کا نام لوگوں میں معتبر تھا۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق مسعود اپنے وقت کے مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ عربی فارسی اور ہندی پر بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ فنی، پختگی زبان و بیان میں کامل دستگاہی، انداز کی انفرادیت اور حسن و پرکاری کے ساتھ ساتھ شاعری میں تاریخی و قائع نگاری انہیں نا صرف ہم عصر شعرا بلکہ بعد میں آنے والوں کے درمیان بھی ایک امتیازی مقام عطا کرتی ہے جس۔ مسعود کو خود بھی اپنے فنی عظمت کا احساس تھا سو وہ کہتے ہیں:

کسی اربپا رسی و تازی امتحاں کر دی
مرا مبارزِ میداں امتحان شدمی(11)

مسعود فقط شعر و سخن کے شاہسوار نہ تھے بلکہ ان کی عملی زندگی بھی تگ و تاز و فعالیت کی مظہر ہے۔ وہ سخن وری کے میدان سے دلاوری کی سرحدوں تک بخوبی سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں اوصاف کی بدولت وہ سیف الدولہ کی فوج میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے اور اس کے ساتھ میدان جنگ میں کارہائے نمایاں سرانجام دیتے رہتے تھے سو وہ کہتے ہیں:

مسعود سعد سلمان دربزم ورزم تو
جاری زبان خطیب و نبردہ سوارباز
در بزم باد بر تو ثنا گوئی و مدح خواں
و اندر نبرد حملہ برو جان سپار باد(12)

اپنے ایسے اوصاف کی بدولت وہ اس وقت کے حکمران سیف الدولہ کے منظور نظر اور دربار میں طوطیِ سخن تھے۔ اس عہد کے دیگر شعراء نے برملا انکی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ گو کہ یہ تمام صاحبان خود بھی فارسی شعر و ادب کے شناور اور نامور شاعر تھے مگر مسعود کی فنی عظمت کو انہوں نے ایسے ہی تسلیم کیا ہے جیسے اردو کے عظیم شعرا نے اردو شاعری میں میرؔ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ یہاں چند ایک شعرا کا تذکرہ بر محل ہو گا۔

ابوالفرج رونی:

عظیم فارسی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مسعود سعد سلمان کے استاد بھی تھے۔ وہ مسعود کو نا صرف عظیم شاعر مانتے ہیں بلکہ ان کی شاگردی پر فخر بھی کرتے ہیں۔ فارسی ادب میں اگر قصائد کے حوالے سے بات کی جائے تو استاد کی استادی اپنی جھلک دکھاتی ہے اور رونیؔ کے قصائد بعض مقامات پر مسعود سعد سلمان سے عالی نظر آتے ہیں لیکن اگر "جسیات" کی بات کی جائے تو مسعود ہی اس کے موجد و خاتم ہیں۔ "جسیات" میں استاد بھی اپنے شاگرد کے ہم پلہ نہیں لیکن ایک مئودب شاگرد کی طرح کئی حوالوں سے فنیؔ برتری کے باوجود مسعود خود کو استاد سے ہیچ جانتے ہیں اور ان کی شاگردی پہ تفاخر کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ای خواجہ ابوالفرج نکنی یاد من
تاشا گردد این دل ناشا دِمن
نازم بدانکہ ہستم شاگرد
شادم بدانکہ ہستی ءِاستادِ من (13)

رشید سمرقندی:

"زینت نامہ" کے مصنف کا نام فارسی ادب میں تعارف کا محتاج نہیں مگر شاعری بالخصوص قصائد میں وہ مسعود کی تقلید کو مستحسن جانتے ہوئے اپنے طرز خاص سے ہٹ کے مسعود کا رنگ اختیار کرتے ہوئے ان کی شعری عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ سلطان ابراہیم کے زمانے میں کہ جب مسعود بے گناہ قید کی اذیتیں برداشت کر رہے تھے انہوں نے الفت و محبت سے لبریز کئی شعر نامے ان کے دل بہلاوے کے لیئے قید خانے میں بھی روانہ کئے۔

خواجہ مسعود سعد اگر بیند
کہ مبیناد اگر حوادث گرد
آن نتیجہ کمال شعر وزیر
بفرستد بجای راہ آورد(14)

عثمان مختاری:

اس زمانے کے بڑے فارسی شاعر تھے کہ جن کی تعریف میں امام سنائی نے ایک قصیدہ بھی کہا ہے جبکہ خود اپنے قصائد میں مختاری نے مسعود کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان کے اشعار سے مسعود کی عظمت و مقبولیت مترشح ہے کہ جو ہمیں بتاتے ہیں کہ اپنے وقت کا یہ نابغہ لوگوں کے دلوں میں بلند مقام رکھتا تھا۔ جو لوگ برصغیر آتے تھے وہ مسعود کے اشعار بطور سوغات خراسان تک لے جاتے تھے۔

بر اھل سخن تنگ گشت میدان
وزجای بشد طبع ھر سخندان
ھر طبع کہ بر سحر بود قادر
از عجز چو مسحور گشت حیراں
ہر بیت کم اندیشہ ترز شعرت
شد نادرہ تر تحفہ ءِ خراسان
اشعار ترا در جہان گرفتن
اشد اثر خاتم سلیمان(15)

امیر معزی:

ملک شاہ کے درباری شاعر تھے جو بعد ازاں سلطان سنجر کے دربار سے وابستہ ہوئے مسعود سعد سلمان کی تعریف میں وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

شریف خاطر مسعود سعد سلمان را
مسخر ست سخن چوں پری سلیمان را
زشادی ادب و عقل بدار اسلام
ھمہ سلاست وسعد است سلمان را (16)

سنائی غزنوی:

ایک اہم فارسی شاعر جو مسعود کے مداحین میں شامل تھے۔ انہوں نے مسعود کے منتشر کلام کی جمیعت سے دیوان مرتب کیا۔ لیکن بے تحقیقی و غلط فہمی کے باعث دیگر شعرا کے اشعار بھی شامل دیوان ہو گئے۔ اور بعد ازاں غلطی کی نشاندہی ہونے پر مسعود سے باقاعدہ معافی مانگتے ہوئے کہا:

لیک معذور دار ازآنکہ مرا
معجز شعر ھا ت حیران کرد (17)

سلیمان ایناج بیگ، سید محمد ناصر علوی، عمید حسن:

اپنے عہد کے بڑے شعرا میں شمار ہونے کے باوجود مسعود کے قدر دان تھے۔ ناصر علوی سے مسعود کے تعلقات مثالی نوعیت کے تھے۔ اور اسکی وفات پر مسعود نے مرثیہ بھی کہا۔ عمید حسن نے نہ صرف مسعود سعد کا رنگ سخن اپنانے کی کوشش کی بلکہ اس کی عظمت کے اعتراف میں کئی قصائد کہہ کر مسعود کو لاہور بھی بھیجے۔ مسعود نے اس باہمی الفت کی بجاآوری کے لئے نہ صرف اسے اچھے الفاظ میں یاد کیا بلکہ اس کی نیک نیتی اور شعری عظمت کا اعتراف جوابی قصائد میں برملا کیا ہے۔ ان شعرا کے علاوہ راشدی، ابوالاعلی، عطا یعقوب، اختری، سید حسن، ناصر محمد شمس اور سلمان ایناج بیگ جیسے بڑے شعرا مداحین مسعود میں شامل تھے۔

زگفتار مسعود سعد آنکہ است
وحیدالزماں و بدیع الکلام (ایناج بیگ18)

مسعود گیارھویں صدی عیسوی کے آسمان شعر و ادب کا وہ ستارہ تھے کہ جس کی چمک سے اصحاب سخن کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں لیکن یہ تابناک انجم عین بام عروج پہ تقدیر کے اندھیروں میں جا پھنسا اور تمام تر کوششوں کے باوجود انسانی سفاکیت کی ان ظلمتوں سے چھٹکارا نہ پا سکا کہ جن میں وہ بے جرم و خطا قید ہو گیا تھا۔ مسعود کی شخصی و فنی حیات تین واضح حصوں میں تقسیم نظر آتی ہے پہلا عہد

(80-440ھ/88-1048ء) کہ جب گلشنِ حیات مہکتا تھا۔ رشتے ناطے مضبوط جوان و لازوال تھے۔ وہ اور ان کا خاندان سلاطین کا منظور نظر تھا۔ سلطان سیف الدولہ محمود کے دربار میں ان کا مرتبہ قابلِ رشک تھا۔ دربار میں ان کی زبان دانی کی دھوم تھی اور میدان جنگ میں انکی جرات وولولے کی۔ سلطان کی نظر کرم نے زندگی کو ایک حسین خواب بنا دیا تھا جہاں دولت و حشمت تھی، وقار و سکون تھا ،نام و مرتبہ تھا اور سب سے بڑھ کر ان کا محبوب وطن "لاہور" راوی کے پانیوں میں جگمگاتا اور حیاتِ رنگیں کے ہنڈولے میں ہمکتا تھا۔ یہ شہر مامتا کی وہ مہربان اور بابرکت آغوش تھا کہ جس نے پردیس کے اس اجنبی خاندان کو اپنا رنگ لگا کر بے مثال و آسودہ حال کر دیا تھا۔ مسعود سعد اپنے باپ کی طرح سلطان کی نگاہوں میں معتبر نا صرف ادبی ایوان میں اعلی عہدہ دار تھے بلکہ بادشاہ کی فوج میں بھی وہ خاص مقام کے حامل تھے۔ سیف الدولہ محمود کا عہد حکومت مسعود سعد سلمان کے لیے بہشت ارضی کا دوسرا روپ تھا۔ چنانچہ احسان و تشکر کے احساس سے مغلوب مسعود سعد سلمان نے شہزادے کی تعریف میں بہت سے قصائد لکھے۔ اگر یہ قصائد محض مدح و استحسان پر مبنی ہوتے تو یقیناً سلطان سیف کا زمانہ ختم ہونے کے ساتھ ہی ان کی حیثیت بھی ختم ہو جاتی لیکن مسعود جیسے صاحبِ علم نے ان قصائد میں محض تعریف و مبالغے کی ڈفلی نہیں بجائی بلکہ ان قصائد کو اپنی زیرکی سے مصدقہ تاریخ کا روپ دے دیا ہے۔ مسعود چونکہ جنگی معرکوں میں خود سلطان کے ساتھ شریک ہوتے تھے چنانچہ ان کے لیے سلطان کی عالی حوصلگی، معاملہ فہمی، جرات و بے باکی اور فتوحات ہی زیرِ قلم نہ تھیں بلکہ مبارزہ و مفتوحہ علاقوں کی سرزمین اور لوگ، جنگوں اور لڑائیوں کی صحیح تواریخ، ان علاقوں کی بود و باش فن تعمیر مقابل فوج کے احوال ، آثار اور جنگ میں ان کی حکمت عملیاں اور دیگر معاملات بھی چشم دیدہ اور عبرت گزیدہ تھے۔ چنانچہ اک نابغہ کی طرح انہوں نے تعریف و توصیف کے پامال مگر آسان راستے پر چلنے کی بجائے ایک نیا راہ نکالا اور اپنے قصائد کو مدحیہ سے زیادہ تاریخی بنا دیا۔ اور یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ آج تک برصغیر کی نہ صرف ادبی بلکہ سماجی و تہذیبی تاریخ بھی اس سے مستفید ہو رہی ہے کیونکہ گیارہویں صدی عیسوی کے اہم حکمران سیف الدولہ محمود کہ جس نے برصغیر میں غزنوی بادشاہت کے راستے ہموار کرتے ہوئے مغلوں تک کو ہندوستان میں فتوحات کی راہ دکھائی ان کی ذات و کارناموں کی تفصیل کسی اور تذکرہ و تاریخ نگار کے پاس موجود نہیں۔ اس عہد سے متعلق جب بھی معلومات دستیاب ہوں گی ابوالفرج رونی اور مسعود سلمان کے قصائد سے ہی ہوں گی بلکہ وقائع نگاری میں تو مسعود سعد سلمان کے قصائد اپنے استاد سے بھی کئی قدم آگے ہیں بالخصوص وہ قصیدہ کہ جس میں راجہ جے پال موجودہ شہر آگرہ کے حکمران اور اس کے مضبوط ترین قلعے کے مقابل سلطان سیف الدولہ کی بے مثال فتح کا ذکر کیا گیا ہے تاریخی و شعری ہر دو حوالے سے خاصے کی چیز ہے۔ کہ یہ قصیدہ جہاں سلطان سیف الدولہ کی عظمت، حشمت، بے باکی و استقلال کو نہایت حسن و احتشام سے بیان کرتا ہے وہاں اس عہد کے فن تعمیر، شہر کی چکا چوند، حکمرانوں کی حکمت عملیوں میدان کارزار کی ہولناکی اور غزنی فوج کی جرات و شجات کو نگاہوں کے سامنے مجسم کر دیتا ہے۔۔ یہ طویل قصیدہ گویا ایک مستند داستان ہے جس کا راوی خود چشم دید گواہ بھی ہے وہ ہندوؤں کے اس قلعہ کی مضبوطی، وسعت اور فن تعمیر کو دیکھ کر حیران ہے کہ یہ قلعہ کس قدر محکم و مضبوط ہے۔ دوسری طرف وہ قلعہ بند راجہ اور اسکی پرجا کا احوال بھی بیان کرتا ہے کہ باوجود طاقت و

اختیار کے انہیں سیف الدولہ محمود کے مقابل آنا کس قدر مہنگا پڑا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ راجہ مختلف حیلوں بہانوں سے جنگ کو ٹالنے اور سیف الدولہ محمود کی مراجعت کے لئے مصروفِ عمل ہے مگر کوئی کوشش کارگر نہیں اور بالآخر وقت نزع آگیا ہے دونوں افواج مرنے اور مارنے پر تیار ہیں سیف الدولہ کا لشکر قلعہ والوں کے مقابل غیر محفوظ اور کمزور ہے ان پر ہندوؤں کی طرف سے آگ برسائی جارہی ہے مگر سلطان خود مضبوط اور پہاڑوں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ سو اپنی پوری قوت سے حملہ آور ہوتا ہے۔ مسعود سعد سیف الدولہ کو بے باک شیر گردانتا ہے جو دشمن کی صفوں پر ٹوٹتا انہیں رگیدتا ہوا بے جھجک اپنی فتح کی جانب بڑھتا چلا جارہا ہے اور بالآخر فتح یاب ہو کر لوٹتا ہے۔ باج گزار ہندو راجاؤں کی طرف سے سونے اور ہاتھیوں کے نذرانے کے مناظر لفظی جھروکوں سے بخوبی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ سیف الدولہ کے حوالے سے یہ قصیدہ انسانی و شاہی عظمت و کردار کا ایک نادر مرقع ہے کہ جس نے وقت کی گرد میں گم ہوتے ایک نڈر، بے باک، شجاع اور عالی مرتبت بادشاہ کو زندہ و جاوید کر دیا۔ مگر اس عظیم بادشاہ کے دنیا کے گزرنے کے ساتھ ہی مسعود کی حیات سے سکھ و شانتی کا عہد بھی ختم ہو جاتا ہے۔ "1088ء تا1107ء" سے مسعود سعد سلمان کی زندگی کا دوسرا مگر بھیانک دور شروع ہوتا ہے اس کی جنت ارضی شعلوں کے سپرد ہوتی ہے۔ اور سلطان سیف الدولہ کے ساتھ ہی اس کے باپ کا سایہ بھی اس کے سر سے اٹھ جاتا ہے۔ ایسے میں سلاطین کی طرف سے عطا کردہ شاہی جاگیر ضبط کر لی جاتی ہے اور اپنے وقت کا نامور، بے مثال اور حساس شاعر سوالی بن کر لاہور سے غزنی کا سفر بھاری دل سے کرتا ہے تاکہ وہ اپنی خدمات کے صلہ میں عطا کردہ بخشش کو اپنے والد کے حوالے سے واپس حاصل کر سکے مگر سلطان ابراہیم غزنوی بجائے اس کے دعویٰ حق کو قبولنے کے اس کے مخالفین کے جھانسے میں آکر اسے اور اس کے خاندان کو اپنا مخالف تصور کرتا ہے اور بے بس، بے کس، مسافر اور بے گناہ شاعر کو قید کر دیتا ہے۔(19) کسی شریف النفس بے گناہ شخص پر غریب الوطنی میں قید کی صعوبت جسمانی سے زیادہ نفسی طور پر کیسے عذاب ڈھاتی ہے اسکا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اور مسعود تو ایک شاعر بھی تھا ایسا شاعر کہ جس کے فن و فطانت کا ایک زمانہ مداح تھا۔ جس کے کہے ہوئے لفظ اذہان و قلوب کو منور کرتے تھے۔ زندان کی تاریکیوں میں اپنے لئے امید کی روشنی ڈھونڈ تا تھک رہا تھا۔ مگر ناامیدی کی بھیانک اور اذیت ناک رات دس سال پہ محیط ہو جاتی ہے۔ وہ سات سال تک پہلے "قلعہ ءِ سو" اور پھر "قلعہ ءِ دھک" اور عمر عزیز کے باقی تین سال "قلعہ ءِ نای" میں بسر کرتا ہے۔ یہ محض دس سال کا عرصہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے ارمانوں کا قبرستان ہے جہاں ایک نازک اور حساس طبع انسان بے جرم و خطا غیر انسانی سلوک کا سامنا کرتا ہے۔ وہ پہرہ داروں کی گالیوں کے زخم اپنی روح پر محسوس کرتا ہے۔ اسکے نیلوں پہ پھاہے رکھنے والا کوئی نہیں، وہ میدانِ جنگ کا شہسوار تھا اور ہاتھ باندھے ذلیل و بدقسمت غلاموں کی طرح جبر کی چکی میں جُتا اپنے اندر پل پل مرتی ہوئی زندگی کو دیکھتا ہے۔ ایسے میں اس کے حسین و جمیل بیٹے کی موت اسکی کمر خمیدہ کر دیتی ہے۔ مگر یہ خوددار و عالی ہمت شاعر اپنی انا و خودداری کو پس پشت ڈال کر سلطان ابراہیم کی خدمت میں قصیدے لکھتا ہے ان قصائد میں حکمرانی کے ظلم و ستم کو فراموش کر کے سلطان کی مدح و ستائش کرتا ہے، عظمت و سربلندی کے ترانے گاتا ہے اور بے گناہ قید میں پستے ہوئے اپنی اذیتوں کا ذکر کر کے رہائی کا طلبگار ہوتا ہے مگر اس تمام تر سعی کا حاصل اک غیر مبدّل طویل قید ہے کہ جس

سے رہائی بار بار کی دستک کے بعد بھی ممکن نہیں۔ وہ اپنے رشتوں کے لئے تڑپتا اور بلکتا ہے مگر اس کو قید کرنے والے اسے اس جہنم میں جھونک کے فراموش کر چکے ہیں۔ ان سب اذیتوں پہ مستزاد سب سے بڑی اذیت اس مادر وطن سے جدائی ہے کہ جس نے سدا اسے سکھ و آرام بخشا تھا۔ جو اسے جنت ارضی محسوس ہوتی تھی جسے وہ "لاہور" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ موسم رنگ بدلتے ہیں تو وہ خود کو ارد گرد پھولتے موسموں سے ہم آہنگ نہیں کر پاتا اس کا دل لاہور کی پھوار کے لیے تڑپتا ہے اس کا وجود لاہور کے گلابی جاڑوں کی چاہ کرتا ہے۔ اس کا من اس شہر کے فضا میں سانس لینے کو مچلتا ہے۔ عید آگئی ہے چہار جانب خوشیاں ہوں گی مگر یہ خوشیاں اس کے لیے بے معنی ہیں کیونکہ اسکی خوشی تو لاہور میں رہ گئی ہے وہ اس دھرتی کو مادر وطن کے طور پر یاد کرتا ہے اور بیٹے کی طرح اس کی جدائی میں آنسو بہاتا ہے وہ کہتا ہے:

رسید عید ومن از روی حور دلبر دور
چگونہ باشم بی روی آن بہشتی حور
چو یاد شہر لاہور و یار خویش کنم
نبود کسی کہ شد از شہر ویار خویش نفور
مرا کہ دیگر کاری درست عید فرخ آباد
نگار من بہ لہاور و من بہ نیشا پور (20)

رشتوں سے جدائی، کسمپرسی کا عذاب اور بار بار رہائی کی فریاد کی بے ثمری ایک طرف اور اپنے وجود کی مٹی سے جدائی ایک طرف۔ قید کے ہر لمحے میں وہ گھر والوں سے زیادہ اس شہر کو یاد کرتا ہے کہ جسکی فضا اس کے خون میں مہک بن کے گردش کرتی ہے۔ جس کی بانہوں میں اس نے خوشیوں کے ہنڈولے جھولے تھے۔ جسکی دھرتی پہ اس نے عظمت وافتخار کے تاج پہنے تھے جہاں وقار والفت اس کے ہم رکاب رہے تھے مگر رہائی کی ہر امید منقطع ہو جاتی ہے سو دل مضروب فریاد کرتا ہے:

کار اطلاق من چوبستہ بماند
کہ ہمیں ایزدش بنکشا ید
مرا مرا عاجتے ہمی باشد
وزدلم خاز شے ہمی زاید
مخملے باید از خداوندم
کہ از و بوئے لو ہو ر آید
کہ ہمی ز آرز وے لوہاور
جان و دل در تنم ہمی ناید(21)

جبکہ ایک اور قصیدہ میں اس شہر دلپذیر اور اس کی بے مثال آغوش محبت کو یاد کرتے ہوئے یہ بیٹا یوں فریاد کرتا ہے:

اے لاہور دیحک بے من چگونہءِ
بے آفتاب تاباں روشن چگونہءِ
تا ایں عزیزی فرزند از توجد اشدہ است
بادرد او بنوحہ و شیعون چگونہءِ
تومر غز ار بودی ومن شیر مرغزار
بامن چگونہ بودی بے من چگونہءِ (22)

بالآخر دس سال کی قید بامشقت کے بعد ابو القاسم خاص کی سفارش پر مسعود کو رہائی نصیب ہوئی اور اس کی خاندانی جائیداد بھی واپس کر دی گئی۔ اسی دوران سلطان ابراہیم کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا "سلطان مسعود" تخت نشین ہوا جس نے اپنے بیٹے شیر زاد کو اپنے نائب کے طور پر ہندوستان کی حکمرانی سونپی۔ شیر زاد کا سپہ سالار "ابو نصر فارسی" مسعود سعد سلمان کی علمی و عملی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھا سو اس نے اس نابغہ کو قید سے رہائی کے بعد چلندر (جالندھر) کا حکمران مقرر کیا یہ ریاست لاہور کی حکمرانی کے تابع تھی۔ مگر عظمت و آسودگی کا یہ زمانہ نہایت مختصر رہا کہ جلد ہی ابو نصر شاہ و شاہی دونوں کے لئے بے اعتبار ٹھہرا اور اسے اور اس کے تمام حواریوں کو بحکم شاہی معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ "قلعہ ءِ مرنج" ان کا ٹھکانہ ٹھہرا اور یہاں مسعود سعد سلمان دوبارہ 8 سے 9 سال تک قید رہا اور یہاں بھی تقدیر کا ستم اور مسعود کا رنگِ سخن برابر فعال رہا۔ اس قید کے دوران بھی مسعود سعد سلمان نے بہت سے قصائد لکھے لیکن ان قصائد میں یادوں کے ساتھ ساتھ درد و غم کی شدت بہت زیادہ ہے گو کہ قصیدے کے ستائشی تقاضوں کے تحت مسعود نے سلطان مسعود کو راضی کرنے کے لیے مدح و ستائش کے باب بھی قلمبند کئے ہیں مگر قید کی تلخی و عمرِ رواں کی لاحاصلی نے غم والم کی سیاہی کا رنگ بہت گہرا کر دیا ہے ۔ اب کی بار قید پہلے سے بھی زیادہ سخت تھی کہ اب مسعود سعد سلمان شاہی سلطنت کے غداروں کی فہرست میں آن ٹھہرا تھا اس کے قصائد اس بات کے غماز ہیں کہ ہر قسم کا ظلم و ستم اس پر روا رکھا گیا ذہنی و جسمانی اذیت، بھوک، پیاس موسموں کی شدت، مشقت و تکلیف کے باعث اس کا وجود گویا اک دکھتا ہوا ناسور بن گیا تھا۔ سو اگر وہ "واہ" بھی کرنا چاہتا تھا تو لبوں سے بے اختیار "آہ" نکل جاتی تھی۔ زندگی کے جبر نے جہاں مسعود کی ذات کو خاک کیا وہیں اس کے فن کو درد و غم کی بھٹی سے گزار کر ایسا کندن کر دیا کہ اس کندن کی چمک دمک صدیاں گزرنے کے بعد بھی آبدار ہے۔ اور اس آبداری کو فارسی ادبیات نے "جسیات" کے نام سے پکارا ہے۔ قصائد کا یہ ایک نیا آہنگ تھا جسے اختیاری طور پر اپنایا نہ جا سکتا تھا۔ یہ فقط مسعود سے مخصوص تھا کہ جہاں پہ آنسو اور قہقہہ ایک ہی مقام پر آن ٹھہرے تھے۔ اسے اختیار کرنے کے لئے اس درد، ظلم، شدت اور اذیت کو روح و جسم پر جھیلنا ضروری تھا کہ جو مسعود نے سالوں تک اپنی ذات پر برداشت کی۔ خوشی و غم، آہ و واہ اور شعلہ و آنسو کے امتزاج ان قصائد نے فارسی ادب میں مسعود کے جسیات کا نام پایا، بقول نظامی عروضی یہ قصائد

اس قدر دردناک ہیں کہ انہیں پڑھ کر بے اختیار رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور آنکھیں برسنے لگتی ہیں۔ مگر اس تمام تر آہ و صدا کا اثر حکمرانوں کے پتھر دلوں پر نہ ہو سکا اور زندان اس کی عمر عزیز کے بیش قیمت سال نگل گیا۔ زندان میں داخل ہونے والا جوان توانا اور زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور شاعر جب زندان سے دوسری بار رہا ہوا تو وہ بوڑھا، دل شکستہ اور ناامید ہو چکا تھا۔ "قلعہ ءِ مرنج" کی اذیت و آلام کا منظر نامہ مسعود کے اشعار میں جابجا جھلک اٹھتا ہے جہاں مشقت اور سخن کی چکی برابر چلتی رہی ایک نے وجود کو خستہ کر کے بدن کو شکستہ کیا اور دوسری نے اسی شکستگی و خستگی سے جسم کی فنا کو فن کی بقا میں بدل ڈالا فنّ سچائی کی یہی آنچ قاری کے دل کو پگھلاتی ہے اور وہ مسعود کے استخوانی وجود اور زنجیروں کی چبھن سے بے چین ہو اٹھتا ہے۔

گر خوردنی یابم ھر ہفتہ یکی روز
از دست مرا کاسہ و از زانوں خوان است
بر ھیچ کہ بزندانیاں گویم کہ چہ دار
گوید کہ نخور ھیچ کہ ماہ رمضان است
گو بیش کہ بیمارم رو شربت آب آر
خندہ زن و گوید خود کار در آن است
بد بخت کسی ام کہ از آن نعمت چندان
امروز ھمہ قصہ من قصہ نان است (23)
ہستمن انیک درین حصار مرنج
کندہ وسوختہ نہ خان ونہ بان
شکم و شیت من درین یک سال
واللہ اریافتہ است جامہ و نان (24)

قلعہ ءِ مرنج کی قید کے دوران چونکہ انہیں شاہ سے بے وفائی و غداری کے شبہ میں قید کیا گیا تھا سو قید کا عذاب پہلے سے دوچند تھا۔ غیر انسانی جانوروں جیسا سلوک، ذہنی و جسمانی اذیت، بھوک و پیاس کی شدت، موسموں کی سختی، پہرے داروں کی ستم ظریفیاں غرض یہ دوسری قید ایک نوع کا عذاب تھی جس میں گرفتار ایک عظیم شاعر اپنی بقا کے لیے جہد مسلسل سے دوچار جسم و روح کو زخمی کرنے والے ہاتھوں کو دعا دیتا ہے ان کی تعریف کرتا ہے اور اپنی اذیت ناک حالت زار کا بیان کر کے لمحہ ءِ حال سے مایوسی کے باوجود انصاف و رحم کی امید زندہ رکھتا ہے۔ ظلم و بے بسی اور آس و نراش کا عجب امتزاج یہ قصائد ہیں کہ جن کو پڑھ کر دل خون خون ہوتا ہے اور تقدیر و انسانوں کی ستم پسندی پہ آنکھ بے اختیار بار بار چھلک جاتی ہے

دوسری قید سے رہائی کے بعد مسعود کی حیات کا آخری حصہ شروع ہوتا ہے (ء1121-1107ء) یہ عہد سلطان مسعود کے عہد حکومت کا اختتامی دور ہے اس کے بعد سلطان شیر زاد، سلطان ارسلان، ملک شاہ اور سلطان بہرام کا دور حکومت مسعود کی حیات میں مجبوری بن کر آتا ہے اور ایک آزاد و حساس شاعر حیاتِ ناپائیدار کے وسیلہ کے لیے زمینی خداؤں جیسے بادشاہوں کی مدح وستائش سے بیزار ہونے لگتا ہے یہاں پر حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ فن جس کی سرحدیں لامتناہی اور پروازِ آزاد ہے محض کہنے کی حد تک آزاد ہے۔ فنکار خواہ مسعود سعد سلمان ہوں یا محمد حسین آزاد زندگی گزارنے کے لیے انہیں خود پہ جبر کرنے والوں سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ یعنی اپنی اور اپنے وابستگان کی حیات کے لیے روح کی سچائی اور جذباتِ قلبی کو مردہ کرنا پڑتا ہے۔ سو مسعود نے بھی کیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مندرجہ بالا حکمرانوں کی مدح میں تسلسل سے قصائد لکھے مگر اس جیسا بے ضرر شاعر اب بھی حکمرانوں کی نگاہ میں ساقط الاعتبار تھا سوسوائے بہرام شاہ کے کسی اور بادشاہ کی نگاہ التفات اس پر نا ٹھہری بہرام شاہ جو خود بھی عالم تھا اور عالموں کی قدر کرنا جانتا تھا اس نے مسعود سعد سلمان کو اس کا کھویا ہوا مقام دینے کے لیے اپنے دربار میں بلند مقام عطا کیا اپنا منظور نظر رکھا اور اس کی صعوبتیں سہل کرنے کے لیے مالی آسودگی فراہم کی مگر وہ دل کہاں سے لاؤں کہ زندہ کہیں جسے کے مصداق مسعود کی رغبت شاہ وشاہی ہی نہیں زندگی سے بھی کم ہو چکی تھی اپنی حیات کے 20 قیمتی سال زندان کی صعوبتوں کی نظر کرنے والے شاعر کے لئے حیات اور اس کے تقاضے بے معنی ہو گئے تھے وہ جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی شکست خوردہ ولاچار ہو گیا تھا وہ جوانی کے ایام کو کرب واذیت کے کردار کے طور پر یاد کر کے کہتا ہے:

دریغا جوانی و آن روزگار
که از رنج پیری تن آگهه نبود
نشاطِ من از عیش کمتر نشد
امید و من از عمر کوتاه نبود
زسستی مرا آں پدید آمد است
درین مه که هر گز در آن مه نبود
سب خشک شدچشمه بختِ من
مگر آب جان چشمه راه رهِ نبود (25)

مسعود سعد اپنے زمانے کے نابغہ تھے اگر فارسی ادب وشعر کے چند شعرا کا ذکر کیا جائے تو مسعود کا نام سرفہرست ہو گا بالخصوص جسیات کے حوالے سے۔ خاقانی فارسی شاعری کے روشن چراغوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے سات ماہ کی قید کے نتیجے میں پانچ جسیات تخلیق کیے مگر چونکہ زندگی کی بھٹی میں جلنے کا یہ تجربہ مسعود کے مقابل نہایت مختصر تھا سو کندن بننے سے قاصر رہا، یوں یہ جسیات مسعود کے جسیات کے مقابل خاقانی کی شعری عظمت کے باوجود کمتر ہی رہتے ہیں۔ دراصل مسعود نے اپنے جسیات میں حیات کو اس کی اذیتوں

کے ساتھ جھیلنے کا محض تجربہ ہی بیان نہیں کیا بلکہ وہ خود اس تجربے میں ڈھل کے انسانی درد و غم و حوصلے کا استعارہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے محض درد و غم کے ساتھ نباہ نہیں کیا بلکہ اپنی ذات کو درد و غم میں ڈھال کے ایوانِ شعری میں فن و عرفان کے دیپ جلائے ہیں۔ ان کی آدھی عمر دردناک قید میں گزر گئی جہاں جسمانی و ذہنی اذیت، روح کو چھیدنے والی تنہائی، بچھڑتے ہوئے رشتوں اور بیتی ہوئی حسین یادوں کی یلغار لمحہ لمحہ ہستیِ ناتواں کو پامال کرتی تھی تو دوسری طرف خطرناک مجرموں جیسا روا رکھا جانے والا سلوک عزتِ نفس کو کچوکے لگاتا تھا ایک نازک مزاج، صاحبِ کردار، عالم و فاضل شخص کی بے بسی حیات کو جھیلنے کا جو قرینہ اختیار کرتی ہے اسے "جسیات" کہتے ہیں۔ یہ قصائد فطرت ہیں، حقیقت ہیں اور درد ہیں ان کا مقصد نہ تو عبارت آرائی ہے اور نہ ہی معرکہ آرائی یہ محض زندگی کی شدتوں اور ظلمتوں میں سر اٹھائے رکھنے اور سلیقے سے نباہنے کا اک قرینہ ہیں سو ان قصائد کا کسے بھی دوسرے شاعر کے مقابل زیادہ حقیقی، بامعنی اور پر تاثیر ہونا لازم ہے اسی بنا پر خاقانی کے مقابل مسعود کا انداز بیان اور کلام کی تاثیر دوچند ہے ان قصائد کا حزن و ملال پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لیتا تادیر درد کے دائرے سے نکلنے نہیں دیتا۔ خاقانی کے جسیات اس تاثیر سے محروم ہیں نیز اپنی ادق بیانی و صناعی کی بنا پر نمائشی سے محسوس ہوتے ہیں۔ مسعود نے چونکہ اپنے درد اور حالِ زار کو زبان دی تھی سو بیانیہ کے لیے فطری انداز اور سلاست و شستگی لازم تھی مسعود کے جسیات اسی فطری پن کا نمونہ ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں فنی لطافت کا فقدان ہے اور یہ محض آہ و زاری و واویلا ہیں۔ ایک فن شناس عظیم شاعر کی طرح کہ جس کے دامن میں الفاظ و معانی کے خزینے چھپے ہوتے ہیں مسعود بھی اس خزینے سے مالا مال لفظ و معنی کے موتی پروتے ہیں کہ جنکی چکا چوند ان کے خونِ جگر سے مستعار ہے۔ ان جسیات کی پیشکش آفاقی ہے کہ مسعود ان جسیات کے ذریعے ہر اس عزت دار، بے گناہ اور حساس فنکار کے درد کے نمائندے بنتے ہیں کہ جس پر زندگی نے جینے کی بیگار کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ اسے بے بس ہو کر ارباب اختیار سے فریاد بھی کرنا ہے تو مدح و ستائش کے پردے میں، کیونکہ ظلم کے ضابطوں میں جینے کا ڈھنگ فقط یہی ہے کہ زخم کو زخم نہیں پھول بتایا جائے۔ عظمتِ انسانی کا یہی شعری و فنّی قرینہ ہے کہ جس کی بدولت مسعود مشرق ہی نہیں مغرب میں بھی ادبی عظمتوں کی مسند پہ متمکن ہیں ڈاکٹر براؤن اور ایلیٹ کے تراجم اور سخن شناسی جہاں ان کی فنّی و فکری بلندی کا اثبات کرواتی ہے وہیں مشرق میں ڈاکٹر رضازادہ شفق بھی مغربی ادب کے تقابل میں بائرن کے قصائد کے مقابل مسعود کے جسیات کو نا صرف عمدہ گردانتے ہیں بلکہ متعدد خصائص کی بنا پر انہیں بائرن کے قصائد سے برتر بھی سمجھتے ہیں۔(26)

زندگی کی تنگنائے میں بار بار کی خشک سالی نے آہستہ آہستہ مسعود کا وہ حوصلہ پست کر دیا تھا کہ جس کے سہارے انہوں نے اسیری کی تلخیوں کو جھیلا سو آخری قید سے رہائی کے بعد جو عزت و منزلت انہیں عطا کی گئی اب اس سے ان کا دل اوب چکا تھا حیات کا فلسفہ حقیقت میں بالکل الٹ تھا یہاں علم و ادب سے زیادہ طاقت و اقتدار حاوی تھا اور انصاف ان کے مقابل اندھا۔ ایسے میں علم کیا اور اس کا حصول کیا سو عمر کے آخری سالوں میں وہ بے معنویت و لاچاری سے مغلوب ہو کر کہتے ہیں کہ:

خویش را در جہان علم کردن

هست بر خویشتن ستم کردن
نیست از عقل گر بیند یشی
تکیہ بر تیغ و بر قلم کردن(27)

جب علم وہنر کا فائدہ ہی نہیں تو پھر اس کارِ بے کار کو کرنے سے کیا حاصل ؟وہ عظمت وبخت جو صدیوں سے علم کے نام پر لوگوں کو حاصل تھا مسعود کے لئے بے وقعت وبے معنی،لاحاصل وبے وقت ٹھہرا۔اگر وہ مجرم احتجاجی یا غدار ہوتے تو کوئی بات بھی تھی اور قید کا صلہ بھی ملتا مگر یہاں تو فقط تقدیر کا شکنجہ تھا اور صاحبِ اقتدار کی من مرضی کہ جس کے مقابل

ادھر ایک حرف کہ کشتنی ،یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اڑا دیا ،جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا(28)

کے مصداق مسعود کا کوئی حیلہ، کوئی فریاد، کوئی سعی قابل عمل نہ رہی۔سومیر کی طرح وہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر مسعود نے بھی مر مر کے تمام کی۔ان تمام جذبات واحساسات کے عکاس مسعود کے قصائد ہیں۔اپنی ہستی وخوش بختی پہ ناز کرنے والا شاعر بالآخر خود کو بد بخت ،بد نصیب اور دھرتی کا بوجھ سمجھنے لگا۔یہاں تک کہ مایوسی کے گرداب میں علم اس کے لئے بجھتی ہوئی شمع بن گیا تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ نظم ونثر کو بے فائدہ وکار ضیاع سمجھ کر ترک کرنے پہ مائل ہو گئے:

امروز ہیچ خلق چوں من نیست
جز رنج ازیں نحیف بدن نیست
لرزان ترو ضعیف تر از من
در باغ شاخ و برگ سمن نیست
انگشتر پست پشت من گوئی
اشکم جُزاز عقیق یمن نیست
از نظم و نثر عاجز گشتم
گوی مرا زبان و دہن نیست (29)

مگر یہ سلسلہ طویل نہ ہوا کہ ان کے قلم کا رخ اب دنیا سے مڑ کر آخرت وروحانیت کی طرف ہو گیا اور وہ نیاوی بادشاہوں کی ستائش سے بیزار ہو کر ذاتِ اولی اور نمائندگانِ دین کی طرف رخ موڑ گئے۔یہ عمر بھر کی سختیوں اور عہدِ پیری کا لازمی نتیجہ تھا۔ایسا نہیں ہے کہ کسی بھی ادب وشعر کی تاریخ میں شعرا محض مسندِ عظمت پر ہی متمکن رہے ہیں اور رنج ومصائب یا اسیری ان کے قریب بھی نہیں پھٹکی فارسی ہی نہیں اردو، عربی، ترکی، انگریزی، یونانی، لاطینی اور دیگر زبانوں کے ادب میں بھی ادیبوں کی قید وجلاوطنی کی متعدد مثالیں نظر آئیں گی بلکہ اردو ادب میں تو جعفر زٹلی کی استثنائی مثال موت کی صورت میں بھی موجود ہے لیکن ان تمام میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ

لوگ کسی نہ کسی مقصد یا جرم کی خاطر قید ہوئے مسعود کا المیہ یہ ہے کہ وہ مقصد یا جرم کے بغیر نا صرف قید ہوئے بلکہ اس اذیت ناک قید نے ان کی آدھی عمر نگل لی سو ایسے میں بالآخر ان کا دل برداشتہ، مایوس و رنجیدہ ہونا فطری ہے۔

وللہ کہ چوں گرگ یو سفم واللہ
بر خیرہ ہمی نہند بہتا نم
گر ہر گز ذرہ ءکژی باشد
درمن نہ زپشت سعد سلمانم(30)

مسعود کو نظم و نثر دونوں پر عبور تھا۔ ان کے موجودہ فارسی دیوان میں تقریباً پانچ ہزار اشعار شامل ہیں لیکن یہ مکمل دیوان نہیں ہے ان کا کچھ کلام غیر مطبوعہ بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر نعیم الدین کے مطابق انہیں مسعود کی کچھ ایسی غزلیں مخطوطات کی صورت میں ملیں ہیں کہ جو انکے دیوان میں شامل نہیں(31)۔ جبکہ مہدی حمیدی کے خیال میں مسعود کے اشعار کی تعداد تقریباً15 ہزار تھی جبکہ کچھ دیگر محققین کے نزدیک مسعود کے کلام کا کچھ حصہ ابھی تک دیوان میں شامل نہیں ان حقائق کی روشنی میں مسعود کا دیوان مکمل کلام کے لحاظ سے ابھی تک تشنہ ءِ تکمیل ہے۔ عربی و اردو دواوین کی عدم دستیابی کی بنا پر محققین میں ان کے حوالے سے ایک مسلسل بحث ابھی تک موجود ہے کہ آیا مسعود نے فارسی کے علاوہ بھی کوئی لسانی و شعری سرمایہ چھوڑا ہے کہ نہیں۔ اردو کے حوالے سے محمد عوفی اور امیر خسرو دہلوی کے بیانات اس بات کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ انہوں نے نا صرف ہندی بلکہ عربی دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے مگر ان دواوین کی عدم دستیابی حق کو شک میں بدل دیتی ہے۔ مگر اس حقیقت میں کوئی دورائے نہیں کہ محض فارسی دیوان کی موجودگی ہی ان کی شعری عظمت کے اثبات کے لئے کافی ہے۔ مسعود کا فارسی دیوان صرف شعری حوالے سے ہی نہیں بلکہ تاریخی حوالے سے بھی خاصے کی چیز ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ اس دیوان کے بنا تاریخ کے بہت سے اہم موڑ اندھی کھائیوں میں جا پڑتے ہیں اور بہت سے نامورانِ زمانہ گم نامی میں جا ٹھہرتے ہیں۔ سلطان، علاؤالدین مسعود، شاہ سلطان، سیف اللہ محمود و سلطان ابراہیم کی مدح میں کہے گئے قصائد محض زبان دانی، فنی لطافت، لسانی عظمت و شکوہ کی بنا پر ہی اہم نہیں بلکہ ان سلاطین کی فتوحات اور سلطنت کے متعلقات کے حوالے سے اہم حقائق بھی یہی قصائد فراہم کرتے ہیں سلطان ابرہیم کے ہاتھوں طبرہند (سرہند) اور اردگرد کے علاقوں کی فتح اور شکست کے خوف سے بادشاہِ سرہند کا اپنے لشکر سمیت دریابُرد ہونے کا واقعہ مسعود کے قصیدے میں ہی ملتا ہے۔

ہمہ زمین و زماں خرم است و آبادان
بہ بادشاہ زمین و باشہر یارِ زمان (32)

تاریخ میں سیف الدولہ محمود کا نام اور اسکی فتوحات کا ذکر محض مسعود سعد سلمان کے قصائد کے باعث موجود ہے۔ وگرنہ تاریخ اس عظیم حکمران کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتی گو کہ ابولفرج کے قصائد میں بھی سیف الدولہ سے متعلق معلومات دستیاب

ہوتی ہیں مگر وقائع نگاری کا اختصاص مسعود کا ہی حصہ ہے۔ سیف الدولہ کی تخت نشینی کے واقعات اور صحیح تاریخ مسعود کا قصیدہ بیان کرتا ہے۔ یہ قصیدہ سلطان ابراہیم کی طرف سے سیف الدولہ کو ہندوستان کا حاکم مقرر کرنے کے موقع پر مسعود نے کہا تھا جس کے اشعار میں تخت نشینی کی تاریخ ملتی ہے:

چوں رو چرخ شد از صبح چوں صحیفہ ءِ سیم
زقصرِ شاہ مرامژدہ داد باد نسیم
کہ پادشاہی صاحب قرآن شود بہ جہان
چوں سالِ ہجرت بگذشت تی وسنین وسہ جسیم

(469 ھجری)(33)

خلیفہ بغداد نے سیف الدولہ کو اس کی فتوحات کے ضمن میں ثانیءِ امیر المومنین کا جو لقب دیا اس کے بارے میں تہنیتی قصیدہ میں کہا:

ای ترا خواندہ صنیع خود امیر المومنین
ہمچنین باد اجلالت بر زیاد ت ہمچنین
سیف دولت برتر از ین بیشتر بودہ لقب
عزملت را برا فزون کرد امیر المومنین(34)

تاریخی اہمیت ایک اضافی خوبی ہے کہ جو مسعود کے کلام کو حاصل ہے وگرنہ مسعود نا صرف فارسی قصائد کے حوالے سے بے مثال شاعر تھے بلکہ غزل، رباعی اور مثنوی بھی ان کی نوکِ قلم پہ آ کے حرف زریں بن جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ مسعود کا عہد غزل سے زیادہ قصیدے کا تھا اور غزل کو شاہی سرپرستی حاصل نہ تھی مسعود کی غزلیات نا صرف ہم عصر بلکہ بعد میں آنے والے شعرا کے مقابل بھی بلند مقام کی حامل ہیں۔ اگر ان کا تقابل خود ان کے قصائد سے کیا جائے تو یقینی طور پر یہ پلڑا قصیدہ کے حق میں جھکے گا لیکن مسعود چونکہ زیرک و فن شناس تھے سو ان کے فن کی جھلک غزل کے حوالے سے نامقبول دور میں بھی اپنی اہمیت ثابت کرتی ہے۔

شد چو بہشت برمن ووی زمین ازا بہار
بادِ صبا جلوہ کرد روی گل کامگار
ابر کند ہر زپیکان اشک دیدہ نثار
تادھن گل شبی بر گہر شاھدار (35)

غزل کے ساتھ ساتھ مسعود کے کلام میں رباعیات کی کثیر تعداد بھی شامل ہے۔ گو کہ رباعیات میں جسیات کے برعکس عمر خیام

اور ابوالفرج کا مقام مسعود سے بلند ہے مگر پھر بھی فلسفیانہ فکر لسانی و معنوی آہنگ اور ندرتِ خیال کی بنا پر ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

آرام زخویشتن جدا خوا ہم کرد
جان از قبل تو در جنا خواہم کرد
توپنداری کہ ترا ر رہا خواہم کرد
تا جانِ دارم ترا خواھم کرد(36)

مسعود کے کلام میں مثنویاں بھی شامل ہیں جو انہوں نے درباری امرا اور ہندوستانی موسموں کے حوالے سے لکھی ہیں۔ مسعود نے برصغیر کی دھرتی سے جنم لیا تھا سو اس کے موسم، اسکی مٹی، اس کی فضا اور اس کے لوگوں سے محبت فطری بات تھی اس محبت کا اظہار ان کے ہاں متعدد حوالوں سے ملتا ہے۔ بدیع الزماں اپنی کتاب "سخن و سخنوران" میں مسعود کی مثنویوں کو ان کی فنی پستی پر محمول کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "مسعود کی مثنویاں بہت پست ہیں اگر اس نے نہ کہی ہوتیں تو بہتر تھا" لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ مسعود کی مثنویاں بھی ان کے دیگر کلام کی طرح فکر و خیال کی عمدگی اور ندرتِ بیان کی مثال ہیں ہاں اگر ان کا مقابلہ ان کے قصائد سے کیا جائے تو ان کے مقابل یہ پست معلوم ہوتی ہیں۔ وگرنہ فنی حوالے سے ان میں کوئی جھول یا پستی موجود نہیں ہے۔

بر شگال ،ای بہار ہندوستان
ای نجات از بلدی تابستان
وادی از تیر مہ بشارتِ ھا
بازر لیستم ار آن مرارت ھا
ہر سو از ابر لشکری داری
در امارت مگر سری داری(37)

امیر خسرو کی طرح مسعود بھی اصلاً اہل فارس ہونے کے باوجود برصغیر کے بیٹے تھے۔ اس دھرتی اور اس کی محبت پر انہیں فخر ہے۔ وہ اس کے موسموں، رنگوں، جذبوں اور شدتوں سے بے بہرہ نہیں بلکہ اس میں کامل ہیں اسی بنا پر وہ جہاں بھی جاتے ہیں اس دھرتی کی بو باس ہمہ تن ان کے ساتھ ہے۔ "بارہ ماسہ" خالص ہندوستانی صنف سخن ہے کہ جس میں عشق و محبت کی شدت موسموں کے پیراہن میں اپنا بیانیہ ترتیب دیتی ہے۔ برہا کے ماروں کی تڑپ اور وصل کا انتظار دیپک راگ بن کر نس نس میں سلگن سلگاتا ہے۔ اور یہی انتظار یہی چاہت عشق کی دھیمی آنچ اور ہجر کی چوٹ بارہ ماسہ کا اختصاصی دائرہ ہے جس میں سال کے سارے موسموں اور کیفیات کو انسانی جذبات و احساسات کی تقابلی کیفیات کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ خالص ہندوستانی صنف سخن ہے فارسی ادب اس سے تہی ہے۔ فارسی زبان میں بارہ ماسہ میں اولیت کا تاج مسعود کے سر ہے کہ جنہوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کو موسموں، مہینوں، ہفتوں اور دنوں کی گنتی میں انسانی

کیفیات واحساسات سے مزّین کر حسن ولطافت اور عشق وجذبات کے مسافروں کے لئے وہ راہ ہموار کی کہ جس پر چل کر ہندی بارہ ماسہ نے اپنی شباب کی منازل طے کیں۔

مسعود کا سب سے بڑا امید ان قصیدہ ہے کچھ اس بنا پر کہ وہ دور قصیدے کا تھا اور اسی صنفِ سخن کو شاہی سرپرستی بھی حاصل تھی دوسرا یہ کہ مسعود متعدد بادشاہوں کے منظور نظر بھی رہے اور ان کے قصائد کو شایانِ شان قبولیت میں حاصل ہوئی۔ مسعود کے ہاں قصیدہ دو رنگ میں نظر آتا ہے ااولاً درباری قصائد جو مدحیہ واستحسانی ہیں ثانیاً وہ قصائد جو انہوں نے دورانِ قید لکھے جن میں مدح وستائش کے ساتھ ساتھ حزن وملال اور آپ بیتی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ پہلی طرز کے قصائد میں ان کے ممدوح سلطان ابراہیم، سیف الدولہ محمود، سلطان مسعود، سلطان شیر زاد، ارسلان شاہ، بہرام شاہ اور ان کے دربار سے وابستہ دیگر درباری امرا و وزراء ہیں یہ قصائد لفظی شکوہ ،فصاحت وبلاغت اور زبان دانی کا مرقع ہیں۔ نیز مسعود نے ان قصائد میں جدّت طرازی سے مروجہ رنگ سخن کو تبدیل کرنے کی کوشش بھی کی ہے جو نہایت کامیاب رہی ان کے بعد میں آنے والے ہی نہیں بلکہ ان کے معاصرین نے بھی اس نئے رنگِ سخن کو اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔

دردِ دل چوں خیرہ خیرہ کندِ عشق خار خار
بارنج دیر دیر کند صبر دار دار
درتن خزد ز بویہ وصل تو مور مود
در من جہد زاند ہ ھجر تو مار مار
سر در کشم بجامہ دراز شرم زبر زبر
گر یم ز فرقت تو دل آ زار زار زار
بر دیدہ ام چو اشک رندیار نہر نہر
پیچان شوم چنانکہ کنم جامہ نار نار (38)

ان قصائد کا تنوع خاصے کی چیز ہے۔۔ قید سے قبل کے قصائد میں نشاطیہ رنگ جبکہ قید کے دوران لکھے جانے والے قصائد میں ہمت والم اور آخری قید سے رہائی کے بعد میں لکھے جانے والے قصائد میں حزن کے ساتھ ساتھ کسی قدر قنوطیت ویاس کا غلبہ بھی ہے۔ یہ دونوں قسم کے احساسات ان کے سماجی حالات ونفسی کیفیات کے مظہر ہیں جو مسعود پر ستم ہائے روزگار نے گزارے۔ ان قصائد کی فنی و تاریخی اہمیت مسلّم ہے۔ یہاں تک کہ اس وقت کے ایرانی نابغانِ فن کے مقابل مسعود کے قصائد کسی طور کم تر نہیں ٹھہرتے ان کی علمی فضیلت، زندہ دلی، زیرکی تخیل کی بلندی اور ندرتِ ادا نے انہیں جو خاص مقام عطا کیا تھا اس تک پہنچنے کی کوشش اس وقت سے اب تک بے شمار شعرا تقلیدی صورت میں کر چکے ہیں۔ قصائد سے اگلا قدم "جسیات "ہیں سلطان ابراہیم اور ان کے درباری امرا کی مدح وستائش

اور مسعود کی حیات کی کسمپرسی سے متعلق لکھے گئے ان فن پاروں کے موجد اور خاتم مسعود خود ہی ہیں یہ مدح و ملال کا عجیب امتزاج وہ قصائد ہیں جن کے حوالے سے اوپر بات ہو چکی ہے۔ انکے دیگر فنی اظہارات کی طرح یہ قصائد بھی محض تعریف و درخواست کا شعری نسخہ نہیں بلکہ اس زمانے کے حالات و واقعات اور قید خانوں کی زندگی، سختیوں، قیدیوں کی کیفیات، قید خانوں کی تعمیرات، قیدیوں سے کئے جانے والے سلوک بالخصوص خود مسعود سے کیے جانے والے دردناک سلوک کی داستان ہیں کہ اس زمانے میں قیدیوں کی مشکلات کیا تھیں اور ان سے کس نوع کا سلوک روا رکھا جاتا تھا نیز سزاؤں کی کیفیات و معاملات کیا تھے:

گرمہ با سہ داشتم بلو ہور
دین بر ہمہ کس عیان است
امرو زمہ وسال شد کہ مویم
ماندہ موی کافران است
گوی نمدتر گران است (39)

ان جسیات کی خاص بات فقط درد، اذیت، قید و بے بسی کا احساس ہی نہیں بلکہ مٹی کی وہ کشش بھی ہے جو نمایاں تر ہو کر اپنا جلوہ دکھاتی ہے اور مسعود ملن کی آس کے سہارے دکھ بھوگنے کا حوصلہ پاتے ہیں۔ مسعود قید کے ان لامحدود اور اذیت ناک لمحوں میں اپنے جنت نظیر وطن لاہور کے شب و روز کو یاد کر کے بے قرار ہو اٹھتے ہیں۔ وہ اس کی مہکتی بہاروں کا لمس چاہتے ہیں مگر غزنی کی بیڑیاں انہیں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اس کی آزاد فضاؤں میں اڑنا چاہتے ہیں مگر پابند سلاسل ہیں وہ اس دھرتی پہ دوبارہ سانس لینے کی آرزو میں جیتے ہیں ۔اس دھرتی پہ چھوڑ آئے اپنے رشتوں سے دوبارہ ملنے کی حسرت لئے ان قصائد کی موہوم امید کے سہارے کرب کی بھاری راتیں سر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہیں۔ قصائد کے مقابل مسعود کے جسیات تمام شعراء سے برتر اور عظیم تر ہیں یہاں تک کہ ابو الفرج جو مسعود کے استاد ہیں اور خاقانی جو اپنے نام کا شہرہ سارے عالم میں رکھتے ہیں ان کے برابر نہیں ٹھہر پاتے۔ یہ جسیات بھی دیگر قصائد کی طرح نا صرف تاریخی حوالے سے اہم ہیں بلکہ خود مسعود کی سوانح عمری بھی بن جاتے ہیں۔ وطنیت و انسانیت ان جسیات کا نقطہءِ خاص ہے کہ جو بعد ازاں پھیل کر امیر خسرو کے دھرتی عشق تک پہنچا اور شعر و ادب میں فارس والوں کے ہاں ہندوستانی محبت کو لازوال کر گیا۔

مختصر یہ کہ مسعود سعد سلمان کی ذات دنیا میں زمانے کی بے ثباتی اور تقدیر کی ستم ظریفی کا استعارہ بن کر اس انسانی کردار کو عظمت و ثبات عطا کرتی ہے کہ جس کے لیے میر نے کہا تھا:

جس نے ہر ایک پہ گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

انسان جو خدائے ذوالجلال کا شاہکار ہے۔ مصائب کے مقابل ڈٹ جانے اور گر گر کر اٹھنے کے باعث بے مثال و سرفراز ہے اس آئینے میں مسعود کی ذات نمایاں نظر آتی ہے علم و فن کے لازوال خزینوں کا امانت دار انسان مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہو کے بھی علم و فضل سے اپنا تعلق منقطع نہیں کرتا۔ رد عمل کے طور پر بدی کو اختیار نہیں کرتا اور نہ ہی کم ہمتی کے باعث زندگی کو بے کسی و بے بسی کے حوالے سے تیاگتا ہے بلکہ وہ جہاد کرتا ہے۔ جہاد کے لیے اس کے ہاتھ میں ہتھیار نہیں قلم ہے۔ اور وہ قلم کے ساتھ ہر زاویہ، ہر روزن اور ہر حصار پر چوٹ لگاتا ہے۔ وہ ساری دنیا کے لیے اپنی بے گناہی کا پیام بصورت آہ و کراہ چھوڑ جاتا ہے کہ جب ظلم ہو تو بے بسی کے عالم میں آہ و کراہ بھی جبر کے مقابل للکار بن جاتی ہے۔ جب آپ کے حق میں صدائے احتجاج بلند کرنے والے موجود نہ ہو تو خود اپنے احساس کی آواز بننا ہی سب سے بڑی سچائی اور سب سے بڑا احتجاج ہے۔ اور اس احتجاج میں مسعود کامیاب نظر آتے ہیں گو کہ آخری ایام میں وہ جان گئے تھے کہ انسانی خدمات و ستائش بے معنی ہے اور انہوں نے اپنی ساری حیات اس بیکاری میں گزار دی مگر اس خیال کے باوجود ان کی فنی عظمت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ان کا دیوان، رنگینی، رعنائی، جدت، ندرت، وقائع نگاری اور فکر و خیال کی اونچائی کا حسین مرقع ہے۔ انکی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ فارسی استادان فن انوری، سنائی، ادیب، صابر اور مختاری جیسے شعراء ان کے طرز خاص کی پیروی مستحسن جانتے ہیں۔ زبان دانی اور علمِ بدیع و بیان کی ندرتوں کے ساتھ ساتھ محاورات کے استعمال میں جو کمال مسعود کو حاصل تھا کسی اور شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا ان کے قصائد میں واقعات کی تصویر کشی مصوری سے مشابہ نظر آتی ہے۔ جدت و ندرت کی تشکیل کے لئے مسعود فرسودہ محاورات، لفظیات اور تشبیہ و استعارات سے ہاتھ کھینچ کر اپنے لئے اک نیا جہان فن پیدا کرتے ہیں ایک بات یا خیال کی تکرار ان کو گوارا نہیں سو وہ اس سے گریز کرتے ہیں:

اشعار من آنست کہ در آنست کہ درصنعتِ نظمش
نہ لفظ معار است و نہ معنی مثنی (40)

مسعود کے لئے دھرتی کی محبت ماں کی محبت ہے اور اس ماں کی کوکھ کی تڑپ فارسی ادب سے آگے اردو ادب میں اس شاعری کی بنیاد رکھتی ہے کہ جسے وطنیت و قومیت کی شاعری کہا جاتا ہے۔ مسعود کے جسیات برصغیر میں اس شعری، فنی و انسانی وقار کا نقشِ زریں ہیں کہ جس کے نشانات محبت و عظمت بن کر صدیاں گزرنے کے باوجود زندہ و پائندہ ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ محمود شیرانی "پنجاب میں اردو" اترپردیش: اردو اکادمی اترپردیش، 1982ء، ص37

2۔ ایضاً۔

3۔ محمد عوفی "لباب الالباب" جلد اوّل ایڈورڈ براؤن، 1903ء، ص246

4۔ امیر خسرو، "امیر خسرو: دیباچہ دیوان غرت الکمال، مرتبہ (سید وزیر الحسن) لاہور: مطبع عالیہ 120 ٹمپل روڈ لاہور، سن ندارد، ص64

5۔ محمود شیرانی "پنجاب میں اردو" ص38

6۔ Iqbal Hussain " Early Persian poets of India ," Patna, PN, 87 ,

7۔ مسعود سعد سلمان "دیوانِ مسعود سعد سلمان" مطبوعہ رشیدیا سمی، تہران، 1318ء، ص281

8۔ ایضاً۔ ص56

9۔ امین احمد رازی، "ہفت اقلیم" مطبوعہ تہران، 1010ھ، ص554

10۔ مسعود سعد سلمان "دیوان مسعود سعد سلمان" ص703

11۔ ایضاً۔ ص511

12۔ ایضاً۔ ص87

13۔ ایضاً۔ ص620

14۔ ایضاً۔ ص729

15۔ ایضاً۔ ص40

16۔ ایضاً۔ ص731

17۔ ایضاً۔ ص604

18۔ ایضاً۔ ص734

19۔ ابو الفرج نصر بن رستم نامی شخص جو مسعود کی طرح لاہور ہی کا باشندہ اور درباری اثر و رسوخ کا حامل تھا۔ یہ شخص مسعود کی سلاطین سے بڑھتی ہوئی قربت اور اس کی ناموری سے حسد و جلن کرنے لگا اور سلطان ابراہیم کو مسلسل مسعود کے خلاف بھڑکاتا رہا۔ جس کی باتوں میں آکر سلطان ابراہیم نے مسعود کو قید کروادیا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ابو الفرج نام سے دھوکہ کھاتے ہوئے ابو الفرج روفی کو مسعود کا دشمن گردانا ہے اور مسعود کے مندرجہ ذیل شعر کا حوالہ استعمال کیا ہے:

ابوالفرج شرم نامدت کہ بجہد
بچنیں حبس و بند افگندی

(دیوان مسعود سعد سلمان ، ص 635)

لیکن بعد کی تحقیق نے ثابت کیا کہ یہاں "ابوالفرج" سے مراد ابوالفرج روفی نہیں بلکہ ابوالفرج نصر ہے۔ کیونکہ ابوالفرج روفی کی توصیف مسعود نے اپنے ایک قصیدے میں کرتے ہوئے ان کے لئے الفت واحترام کا انداز اپنایا ہے۔ جس کا حوالہ متن میں موجود ہے۔

20۔ دیوان مسعود سعد سلمان، ص281

21۔ ایضاً۔ ص280

22۔ ایضاً۔ ص493

23۔ ایضاً۔ دیباچہ

24۔ ایضاً۔ ص455-56

25۔ ایضاً۔ ص122

26۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا "ادبیاتِ فارسی در ایران" تہران، 1935ء، ص197-98

27۔ ایضاً۔ ص426

28۔ فیض احمد فیض "نسخہ ہائے وفا (دست تہِ سنگ، ص65)، لاہور: کتبہ کارواں، 2005ء، ص355

29۔ دیوان مسعود سعد سلمان، ص91-92

30۔ ایضاً۔ ص353

31۔ نعیم الدین، ڈاکٹر، "ہندوستان میں فارسی ادب"، دہلی: نازیہ پرنٹرس، ص77

32۔ دیوان مسعود سعد سلمان، ص32

33۔ ایضاً۔ ص232-233

34۔ ایضاً۔ ص46

35۔ احمد بن محمد کلاتی، "مونس الاحرار" (قلمی نسخہ 1411) مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ، ص281

36۔ دیوان مسعود سعد سلمان، ص602

37۔ ایضاً۔ ص561

38۔ "مونس الاحرار" ص106

39۔ دیوان مسعود سعد سلمان، ص587

40۔ ایضاً۔ ص58